فکر و نظر ـــ اسلام آباد　　　جلد : ۳۶　　　شمارہ : ۳، ۴

تفسیر ثنائی اور رد مذاہب باطلہ

تاج الدین ازہری ☆

افراد و امم کی ترقی کا راز قرآن مجید کی حکیمانہ تعلیمات کی پیروی میں مضمر ہے جو بنی نوع انسان کی فلاح و صلاح کے جملہ اجزاء و عناصر پر مشتمل ہیں اور اسی بات کی طرف نبی اکرم ﷺ نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

قرآن میں پہلی اور پچھلی قوموں کے حالات مذکور ہیں۔ اس میں تمہارے فیصلہ جات بھی مرقوم ہیں۔ یہ فیصلہ کن کتاب ہے جو مذاق پر مشتمل نہیں۔ یہ خدا کی رسی ہے۔ یہ ذکر حکیم اور صراط مستقیم ہے۔ علماء اس کو پڑھتے پڑھتے سیر نہیں ہوتے۔ بار بار پڑھنے کے باوجود اس سے اکتاہٹ اور ملال پیدا نہیں ہوتا اور اس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے۔(۱)

اس حدیث پاک کو سامنے رکھتے ہوئے اس کتاب کے زمانہ نزول سے لے کر تا عصر حاضر مسلمانوں نے کتاب الٰہی کے ساتھ خاص تعلق قائم رکھا اور اس کے مطالب و معانی اور اسرار و نکات معلوم کرنے کے لیے جو مساعی جمیلہ سرانجام دی ہیں دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، کلیۃ اصول الدین، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن مجید کے معجزانہ اسلوب اور اس کی حکمتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ہر دور میں علماء کرام نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تفسیریں لکھیں اور اللہ تعالی کی طرف ودیعت کردہ مختلف فنون میں اپنی مہارتوں کو اس کتاب کی خدمت کے لیے وقف کیا۔

برصغیر پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے پہلی دفعہ قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، ان کے بعد ان کے بیٹوں نے اردو میں ترجمے اور تفاسیر لکھیں۔ ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا اور اس طرح تفاسیر کی ایک اچھی خاصی تعداد اب تک ہمارے سامنے آچکی ہے۔ انہیں تفاسیر میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی تفسیر ثنائی ہے جو کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ برصغیر پاک و ہند کی نامور علمی شخصیت تھے۔ ان کا شمار بیسویں صدی عیسوی اور چودہویں صدی ہجری کے اکابر علماء کرام میں ہوتا ہے جو بیک وقت متعدد اوصاف کے حامل تھے۔

مولانا کے آباء و اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ ان کے والد کاروبار کے سلسلے میں امرتسر آگئے تھے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسر میں جون ۱۸۶۸ء (۱۲۸۷ھ) میں پیدا ہوئے۔(۲)

چودہ سال کی عمر میں حصول علم کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس زمانے میں امرتسر میں مولانا احمد اللہؒ کا سلسلہ درس جاری تھا، مولانا ثناء اللہ ان کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔(۳) حدیث رسول پڑھنے کے لیے حافظ الحدیث مولانا عبدالمنان وزیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں سے ۱۸۹۹ء میں سند فراغت حاصل کی۔(۴) وہاں سے فارغ ہونے کے بعد دہلی پہنچے اور شمس العلماء حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کی شاگردی اختیار کر لی اور حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کی سند دکھا کر ان سے حدیث میں سند و اجازہ حاصل کرنے کا شرف حاصل کیا۔(۵) شیخ الکل سے حدیث میں سند و اجازہ سے بہرہ یاب ہونے کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کا رخ کیا لیکن سہارنپور کا قیام بڑا مختصر

© rasailojaraid.com

رہا۔ ان دنوں دیوبند میں حضرت مولانا محمود الحسنؒ مسند تدریس پر فائز تھے۔ مولانا ثناء اللہ باقاعدہ ان کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوگئے اور ان سے معقولات، منقولات اور ہر قسم کی کتب درسیہ کی تکمیل کی اور اس طرح حضرت مولانا عبدالمنان وزیر آبادی اور دیوبند کے درس حدیث میں جو فرق و امتیاز تھا اس سے بھی استفادہ کیا۔ دیوبند کی سند کو مولانا اپنے لیے باعث فخر قرار دیتے تھے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد کان پور کا عزم کیا۔ ان دنوں مسند تدرس پر مولانا احمد حسنؒ متمکن تھے۔ معقول و منقول میں ان کی مہارت کی وجہ سے حلقہ طلبہ میں ان کے درس کی بڑی شہرت تھی اس لیے مولانا نے ان سے استفادہ ضروری سمجھا۔ ۱۸۹۲ء میں مولانا نے مدرسہ فیض عام سے سند فراغت حاصل کی۔(۶)

ان مختلف مدارس کے اسلوب تدریس میں نمایاں فرق تھا، مولانا نے اپنی خود نوشت سوانح میں بھی اس کا ذکر کیا ہے مگر فرق کی نوعیت واضح نہیں فرمائی۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "پنجاب میں حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم میرے شیخ الحدیث تھے، دیوبند میں مولانا محمود لحسن صاحب اور کان پور میں مولانا احمد حسن صاحبؒ استاذ العلوم والفنون میرے شیخ الحدیث تھے اس لیے میں نے حدیث کے تینوں استادوں سے جو طرز تعلیم سیکھا وہ بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں"۔(۷)

اللہ تعالیٰ نے مولانا میں برجستگی اور حاضر جوابی جیسے خصائل کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تھے۔ مولانا نے اپنی تعلیم کے ابتدائی دنوں ہی سے بحث و مناظرہ میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور غیر مسلموں سے بحثیں بھی چھیڑتے تھے، بعض اوقات آپ امرتسر کے گرجا میں تشریف لے جاتے، پادریوں کی تقریریں سنتے اور ان پر ایسے اعتراضات کرتے کہ بیچاروں سے کوئی جواب نہ بن آتا۔(۸) اس پر مستزاد مختلف مدارس کے اسلوب تعلیم نے مولانا کو اپنی ذات میں ایک انجمن بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ بیک وقت مفسر، مدرس، خطیب، ایڈیٹر، مصنف، متکلم اور لاثانی مناظر تھے۔ آپ کی گرفت اس قدر مضبوط اور طاقتور ہوتی کہ

© rasailojaraid.com

حریف کے لیے جان چھڑانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا۔ بڑے بڑے آزمودہ کار اور جہاندیدہ مناظر آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے۔ آپ کی تقریری اور تحریری سرگرمیوں کی بدولت بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور راہ ہدایت پر آگئے۔(۹)

مولانا کی متعدد تصانیف ہیں ان میں سرفہرست وہ تصانیف ہیں جو آپ نے اسلام کی مدافعت اور مخالفین کے جواب میں لکھیں جیسے "تقابل ثلاثہ" اسے آپ نے پادری ٹھاکر دت کی کتاب "عدم ضرورت قرآن" کے جواب میں لکھا۔ اسی طرح اپنی کتاب "اسلام اور مسیحیت" عیسائیوں کی تین کتابوں عالمگیر مذہب اسلام ہے یا مسیحیت، دین فطرت اسلام ہے یا مسیحیت اور اصول البیان فی توضیح القرآن کے جواب میں لکھی۔ عیسائیوں کے رسالہ حقائق قرآن کا جواب معارف قرآن سے دیا۔

آریہ کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب سیتارتھ پرکاش میں جب قرآن مجید پر ایک سو انسٹھ اعتراض کیے گئے تو ان کا جواب "حق پرکاش" لکھ کر دیا۔ آریہ نے جب کتاب "کتاب اللہ وید ہے یا قرآن" شائع کی تو مولانا نے اس کا جواب "کتاب الرحمٰن" لکھ کر دیا اور ان کی کتاب رنگیلا رسول کے جواب میں مقدس رسول لکھی۔ مرزائیوں کے خلاف مولانا نے اتنا لکھا کہ مولانا کو ان کے خلاف اپنی کتابوں اور مختلف رسائل کی تعداد ہی یاد نہ تھی۔(۱۰)

مناظروں کی اس قدر بھرمار اور تحریری جوابات کی اس قدر بہتات کے باوجود آپ ٹھوس اور علمی کام سے بھی غافل نہیں رہے۔ آپ نے قرآن مجید کی چار تفاسیر لکھیں، جن میں سے دو پایہ تکمیل کو پہنچ کر بہت مقبول ہوئیں اور دو پوری نہ ہو سکیں۔

مولانا کی تفاسیر سے پہلے بھی ہندوستان میں کئی ایک تفاسیر شائع ہوئیں جن سے مسلمانوں نے استفادہ کیا اور قرآن کریم کو سمجھا لیکن تمام خوبیوں کے باوجود ایک خلا تھا جسے پر کرنے کی سعادت مولانا ثناء اللہ کو حاصل ہوئی۔

برصغیر پاک و ہند میں کئی قومیں بستی تھیں۔ انگریز کے غالب آ جانے کے بعد ہر مذہب کو آزادی حاصل تھی کہ جس طرح چاہے ایک دوسرے پر استہزا کرے۔ چونکہ

مسلمان ایک عرصہ تک ہندوستان پر قابض رہے تھے اس لیے ہندوستان کی اکثر آبدی کی یہ کوشش رہتی تھی کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح ذلیل کیا جائے۔ انگریز کی بھی دلی خواہش تھی کہ مسلمان کے مذہب کو جتنا بھی ہو سکے مسخ اور ختم کیا جائے، چنانچہ مسلمان ہی زیادہ استہزا اور اعتراض کا نشانہ بنتے تھے۔ ہندوستان میں لکھی گئی تفاسیر مسلمانوں کو قرآن سمجھنے میں تو مدد ضرور دیتی تھیں لیکن یہ نہ سمجھاتی تھیں کہ مسلمانوں پر ہونے والے اعتراضات کا جواب کس طرح دیا جائے۔ حق اور سچ کو اگلے تک کس طرح پہنچایا جائے۔ آریہ اور عیسائی کو لاجواب کس طرح کیا جائے۔

مولانا ثناء اللہ چونکہ مناظر تھے ان کا واسطہ ہر وقت آریہ اور عیسائیوں سے رہتا تھا۔ ان سے تحریری اور تقریری مناظروں کا سلسلہ قائم تھا۔ اس لیے انہوں نے جو تفسیریں لکھیں ان میں مناظرانہ رنگ غالب رہا جہاں بھی کوئی نقطہ ایسا آیا جس کو قاری قرآن کو سمجھنے کے ساتھ آریہ اور عیسائی یا مرزائی یا کسی بھی ملحد پر گرفت میں استعمال کر سکے تو مولانا نے وہاں حسب ضرورت بحث فرمائی۔(۱۱)

مولانا نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنی زندگی میں قرآن مجید کی چار تفسیریں لکھیں۔ ان میں سے دو تفسیریں عربی زبان میں تھیں اور دو اردو زبان میں۔ عربی زبان میں لکھی گئی تفسیروں میں سے ایک "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" ہے۔ مولانا نے اس میں قرآن کی تفسیر قرآن کی آیات ہی سے کی ہے۔ مولانا نے اسے ۱۳۲۱ھ میں مکمل کیا اور ان کی زندگی میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۰۴ء میں اور دوسرا ۱۹۲۹ء میں امرتسر سے شائع ہوا۔(۱۲) دوسری عربی تفسیر "بیان الفرقان علی علم البیان" ہے جو مکمل نہ ہو سکی۔ سورہ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل اس کی پہلی جلد ۱۹۳۴ء میں ثنائی برقی پریس امرتسر سے شائع ہوئی۔ مولانا نے یہ تفسیر عربی ادب، صرف و نحو اور علم المعانی اور علم البیان کے اصول پر لکھی۔(۱۳) اردو زبان میں لکھی گئی تفسیروں میں مکمل ہونے والی "تفسیر ثنائی" ہے اور نامکمل رہ جانے والی "تفسیر بالرائے" ہے۔ اس نامکمل رہ جانے والی تفسیر کی صرف ایک جلد ۱۹۳۹ء میں امرتسر سے شائع ہوئی جس میں مولانا نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے عہد کی مروجہ تفاسیر اور تراجم قرآن کی اغلاط پیش کر کے ان کی اصلاح کی۔(۱۴)

تفسیر ثنائی مولانا ثناء اللہ امرتسری کی نہایت جامع تفسیر ہے جو متعدد بار شائع ہو کر شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۹۵ء میں منظر عام پر آئی اور آخری جلد ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اور یوں اس کی تکمیل پر چھتیس برس کا عرصہ صرف ہوا۔ یہ تفسیر آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔(۱۵) اس تفسیر کے لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا نے شروع میں التماس مصنف کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے:

۱۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان عموماً فہم قرآن سے ناواقف بلکہ شناخت حروف سے بھی ناآشنا ہیں ایسے وقت میں عربی تصانیف سے ان کا فائدہ اٹھانا تقریباً محال ہے۔

۲۔ میں نے مخالفین کے حال پر غور کیا تو باوجود بے علمی اور ہیچمدانی کے مدعی ہمہ دانی پایا۔ خدا کی پاک کتاب پر منہ کھول کھول کر معترض ہو رہے ہیں حالانکہ کل سرمایہ ان کا سوائے تراجم اردو کے کچھ بھی نہیں۔

۳۔ میں نے قرآن کریم کو جامع علوم عقلیہ و نقلیہ بالخصوص علم مناظرہ میں امام پایا۔ دعویٰ پر دلیل ایسے ڈھب کی ادا ہوتی ہے کہ ہر درجہ کا آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکے مگر جب تک حسب موقع شرح نہ کی جائے عام متوسط درجہ کے خاص بھی فہم مطلب سے کماحقہ بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔

۴۔ میں نے بعض مقامات میں رد مخالفین کی طرز پر اور بعض جگہ نادان موافقین کے لیے جوابات لکھے ہیں۔ سو الحمدللہ یہ تفسیر جیسی کہ زمانہ کو ضرورت تھی ویسی ہی تیار ہوئی۔ خدا اس کو قبول فرمائے۔ آمین(۱۶)

مولانا کی اس عبارت سے واضح ہے کہ ان کے مقاصد میں جہاں قرآنی آیات کی توضیح و تشریح مقصود تھی وہیں وقت کے مخالفین اسلام کا رد بھی شامل تھا۔ چنانچہ انہوں نے پوری تفسیر میں کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جس سے مخالفین اسلام کا رد ہو سکتا تھا اور خاص طور پر وہ مقامات جن پر مخالفین اسلام اعتراض کر کے مسلمانوں سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔ اسی لیے مولانا نے اصل تفسیر شروع کرنے سے پہلے مقدمہ میں سید الانبیاء ﷺ کی نبوت کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے جس سے تفسیر کی

قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اس تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مولانا نے مخالفین اسلام آریہ، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے اعتراضات کے عقلی و نقلی جوابات مع دلائل پیش کیے ہیں جن کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ مولانا سورہ بقرہ کی آیت نمبر۴ " والذین یؤمنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك وبالآخرۃ ھم یوقنون" کی تفسیر میں بعنوان " عیسائیوں کی پہلی غلطی" رقمطراز ہیں:

"بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان نے عیسائیوں سے انجیل کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل مانگی تو جھٹ سے انہوں نے یہ آیت یا اس کے ہم معنی کوئی دوسری آیت پڑھ دی اور سائل مسلمان پر زور ڈالا کہ تمہارا قرآن کتب سابقہ کی شہادت دیتا ہے اور ان کی تسلیم کو داخل ایمان بتاتا ہے۔ پھر تم اس سے زیادہ ثبوت کیا چاہتے ہو؟ اس لیے مناسب ہے کہ اس جگہ جو پہلا ہی موقع کتب سابقہ کی تصدیق کا آیا ہے ہم اس امر کی تحقیق کر دیں کہ کتب سابقہ جن کی قرآن تصدیق کرتا ہے وہ یہی ہیں جن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت زمانہ حال کے عیسائیوں سے مطلوب ہے یا اور ان کتابوں کی قدر و منزلت کہاں تک ہے اور یہ بھی واضح کر دیں کہ اس مطلب پر عیسائیوں کا اس آیت کو پیش کرنا مثبت مدعا ہے یا نا سمجھی"

پس واضح ہو کہ کتب سابقہ جن کی تصدیق قرآن کریم نے کی ہے بحیثیت مجموعی یہ نہیں جو اس وقت متداول ہیں۔ یہ تو مثل کتب تواریخ کے ہیں۔ ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ان کا موجودہ طرز بھی بتلا رہا ہے۔ توریت ابتداء سے انتہا تک اور انجیل اوّل سے آخر تک پڑھنے سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ان کتب والے حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہما السلام کے سوا کوئی اور ہی ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہما السلام کے بعد کے واقعات کا اس میں درج ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ ان جملوں کی حضرت موسی اور مسیح کو خبر تک نہیں، کجا یہ کہ خدا کی طرف سے ان پر الہام ہوئے ہوں۔ مثلاً حضرت موسیٰ کی وفات اور بعد وفات کے واقعات کا ذکر توریت میں مذکور ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

توریت کی پانچویں کتاب استثناء میں لکھا ہے" سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے مطابق جو آپ کی سرزمین میں بھی مر گیا اور آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا" اسی طرح حضرت مسیح کے سولی پر جان دینے کا ذکر اناجیل میں بصراحت موجود ہے اور سولی کے بعد کے واقعات بھی ان میں پائے جاتے ہیں۔ ان سب امور پر غور کرنے سے یہ نتیجہ باآسانی نکل سکتا ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے اور لکھنے والے سوا ان دو صاحبوں کے کوئی اور شخص ہوں گے۔

اگر عیسائیوں کا عقیدہ بھی بغور دیکھیں تو وہ بھی اس امر کے قائل نہیں کہ توریت و انجیل موجودہ کے مصنف موصوف انبیاء ہیں بلکہ ان کے خیال کے مطابق بھی ان کے بعد کے لوگ ہیں۔ اناجیل کے مصنف تو یہی لوگ ہیں جن کے نام سے یہ مروج ہیں۔ ایسے ہی توریت کے لکھنے والا اور جمع کرنے والا بھی کوئی اور شخص ہوگا۔ پس یہ ثابت ہوا کہ توریت و انجیل جن کی قرآن کریم نے شہادت دی ہے یہ نہیں ان کو ان کے ساتھ بجز شراکت رسمی کے کوئی شراکت نہیں جیسے کوئی شخص خاندان مغلیہ کا حال لکھ کر اس کا نام گلستان رکھ دے تو وہ شیخ سعدی کی گلستان نہ ہوگی پس اس انجیل موجودہ کے ثبوت میں آیت قرآنی کا پیش کرنا اور آیت شریفہ قرآنیہ کو اپنے دعویٰ میں مثبت جاننا ہرگز صحیح نہیں۔

قرآن شریف نے کہیں یہ نہیں بتلایا کہ انجیل متداول مسیح پر نازل ہوئی یا یہ کہ اس کو بھی مانو بلکہ ایمان کے موقع پر " انزل من قبلك" اور " ما اوتي موسى و عيسى" (یعنی ان کتابوں کو جو تجھ سے پہلے اتریں اور موسیٰ اور عیسیٰ کو ملیں) سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے جو ہم لکھ آئے ہیں۔ رہی یہ بات کہ عیسائی ان کے مصنفوں کو الہامی مانتے ہیں تو پڑیں مانیں۔ اس کا ثبوت ہم کو دیں۔ کسی عقلی یا نقلی دلیل سے ثابت کریں کہ متی، مرقس وغیرہ الہامی تھے اور یہ کتابیں ان کے الہام سے ہیں۔ آیت قرآنی کو پیش کرتے وقت خیال رکھیں کہ دعویٰ کیا ہے اور دلیل کیا ہے۔ دعویٰ اناجیل موجودہ کے مصنفوں کے الہامی ہونے کا ہے اور دلیل سے حضرت موسیٰ اور مسیح کا الہام ثابت ہوتا

ہے۔ "فانی هذا من ذالك"۔

بعض عیسائی بھولے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی غرض سے کہا کرتے ہیں کہ اگر موجودہ اناجیل اصلی نہیں تو اصل لا کر دکھاؤ، ہم اس سے مقابلہ کر کے دیکھیں جبکہ تمہارا قرآن شریف ان کی شہادت دیتا ہے تو ان کا وجود بھی بتلاؤ کہ کہاں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جنگل میں کسی کو چاندی کا ٹکڑا دکھا کر کہے کہ یہ انگریزی روپیہ ہے۔ وہ شخص بوجہ اس کے کہ اس کے پاس انگریزی سکہ نہیں اسے ماننے سے انکار کر دے تو مدعی اپنے دعوی کی یہ دلیل دے کہ اگر یہ روپیہ نہیں تو اصلی روپیہ لا کر دکھاؤ اور اس سے مقابلہ کرو تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصلی کون ہے اور نقلی کون اور اگر نہ ملے تو میرا دعوی ماننا ہوگا۔ ہرگز یہ کلام مدعی کا صحیح نہیں، انکار کی وجہ تو یہ تھی کہ چونکہ اس ٹکڑے پر جو نشان روپیہ بننے کا ہونا چاہئے وہ نہیں اس لیے یہ ٹکڑا روپیہ نہیں۔ اس طرح اناجیل موجودہ کی نسبت بھی مسلمانوں کا خیال ہے کہ قطع نظر ان کے موجودہ طرز کے چونکہ ان میں ایسے واقعات بھی درج ہیں جو حضرت موسیٰ اور مسیح کے زمانہ کے قطعاً نہیں ہو سکتے، اس لیے ہم اس کو انجیل مسیحی نہیں مان سکتے۔ علاوہ اس کے ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ اصلی انجیل کلاً یا جزواً اس میں ہو۔ جیسا کہ بعض فقرات جو حضرت مسیح نے بطور وعظ کے فرمانے ہیں یہی بتلا رہے ہیں۔ چونکہ ایسے فقرات الہامی مجموعہ غیر الہامی میں آکر وہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اس لیے ہم من حیث المجموعہ ان پر غیر الہامی کا حکم لگاتے ہیں پس اناجیل موجودہ کی مثال بالکل یہ ہوگی کہ ایک واعظ قرآن کریم کی ایک دو آیتیں پڑھ کر گھنٹہ دو گھنٹہ تک وعظ کہے۔ پھر اسی وعظ کو کوئی شخص اوّل سے آخر تک کسی اخبار یا رسالہ میں چھپوا دے۔ پس جیسا کہ یہ اخبار یا رسالہ الہامی نہیں ہو سکتا گو اس میں آیات قرآنی بھی ہیں ایسے ہی اناجیل موجودہ الہامی نہیں جب تک عیسائی اس امر کا ثبوت نہ دیں کہ ان کے مصنف بھی الہامی تھے۔ (۱۷)

۲۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۷ "ختم الله علی قلوبهم وعلی سمعهم و علی ابصار هم غشاوة ولهم عذاب عظیم" کی تفسیر میں بعنوان "عیسائیوں کی دوسری غلطی" رقمطراز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں:

"اس مقام پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ جب خدا ہی نے ان کافروں کو گمراہ کیا اور ان کے دلوں اور کانوں پر مہر ثبت کر دی اور ان کی آنکھیں بند کر دیں تو پھر ان کا کیا قصور؟ ایسے لوگوں کو عذاب کرنا انصاف سے دور ہے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں چونکہ یہ پہلی آیت ہے اس لیے ہم اس کے حاشیہ میں کسی قدر مفصل لکھیں گے اور پھر موقع بموقع اس کے حوالہ ہی پر قناعت کریں گے"

تحقیقی جواب سے پہلے یہ بتلانا ضروری ہے کہ اسلام کے قدیمی مہربان عیسائیوں نے اس مسئلہ کے متعلق جو زبان درازیاں کی ہیں وہ انصاف سے بالکل بعید اور فہم کلام سے دور ہیں۔ انہوں نے اس معاملہ میں سوکن کے جلاتے وقت اپنی ناک کی بھی پروا نہ کی۔ قرآن کی ان آیات پر اعتراض کرتے وقت انہوں نے اپنے ہاں کی بھی خبر نہ لی کہ توریت اور انجیل نے بھی اس مسئلہ کو متعدد مقامات پر بوضاحت لکھا ہے۔ توریت کی دوسری کتاب سفر و خروج باب نمبر۴ کے فقرہ نمبر۲۱ میں ہے: "خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جب تو مصر میں داخل ہووے تو دیکھ سب معجزے جو میں نے تیرے ہاتھ میں رکھے ہیں فرعون کے آگے دکھلائیو۔ لیکن میں اس کے دل کو سخت کروں گا وہ ان لوگوں کو جانے نہ دے گا"۔

اس باب کے فقرہ ۲۷ میں لکھا ہے: "خدا نے فرعون کے دل کو سخت کر دیا" اسی باب کا فقرہ نمبر۱۰۔ موسیٰ اور ہارون نے یہ عجائب فرعون کو دکھائے اور خدا نے فرعون کے دل کو سخت کر دیا کہ اس نے اپنے ملک سے بنی اسرائیل کو جانے نہ دیا۔ اسی طرح مقامات ذیل میں بھی اس مسئلہ کا ذکر ہے بغرض اختصار ہم صرف نام بتلانے پر ہی اکتفا کریں گے۔

استثناء ۲ باب کا فقرہ ۳، ایضاً ۲۹۔ باب کا فقرہ ۴، یشوع ۱۱ باب کا ۱۰، قاضیوں ۹ باب کا ۲۳، سلاطین ۲۲ باب کا ۲۱، زبور ۱۰۵۔۲۵، ایضاً ۱۴۸۔۱۶، ۱۷، امثال ۱۶ باب کا ۴، یسعیاہ ۶ باب کا ۹، ایضاً ۲۹ باب فقرہ ۹،

متی ۱۳ باب کا ۱۴، لوقا ۸ باب کا ۱۰، یوحنا ۶ باب کا ۲۴ وغیرہ

پادریوں نے اپنے ہاں کی تو خبر نہ لی ہوگی۔ لی ہوگی تو اپنے کلیسا میں رسوخ بڑھانے کو ناحق اسلام سے الجھے۔ پس پادری لوگ جب تک مقامات مذکورہ کا جواب نہ سوچ لیں ہم سے مخاطب نہیں ہوسکتے۔ فما ھو جوابھم فھو جوابنا۔

اب رہا کہ ایسی آیات قرآنی کا کیا مطلب ہے اور اس سوال کا حقیقی جواب کیا ہے سو اس کے جواب دینے سے پہلے ہم چند اصول بتلانا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ جواب سمجھنے میں آسانی ہو۔ (۱۸)

۳۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۱ " وعلّم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملائکۃ فقال انبئونی باسماء ھو لاء ان کنتم صادقین " کی تفسیر میں بعنوان آریہ قوم کی غلطی رقمطراز ہیں:

اس آیت کے متعلق بھی نافہموں نے بہت ہی ہاتھ پاؤں مارے ہیں مگر بعد غور ثابت ہوتا ہے کہ سب کچھ ان کی نافہمی اور تعصب کے نتائج ہیں۔ قرآن کریم اپنے معانی بتلانے میں بالکل صاف ہے اور بفضلہ تعالیٰ اس کے سمجھنے اور سمجھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور ہوں گے۔

ہماری ہمسایہ قوم آریہ نے اس کے متعلق بہت سے ورق سیاہ کیے ہیں جن کے دیکھنے سے اس قوم کی شوخی اور نئے جوش کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس کہ اس قوم نے باوجود دعویٰ توحید کے جس کی وجہ سے یہ لوگ اسلام سے بہت ہی قریب ہو گئے تھے بجائے فہم و فراست کے تعصب اور ضد سے کام لیا۔ اس آیت کے متعلق ان کے اعتراضات حسب ذیل ہیں:

۱۔ خدا نے فرشتوں سے مشورہ کیا جس سے اس کی بے علمی ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ باوجودیکہ فرشتوں نے جواب معقول دیا مگر خدا نے (معاذ اللہ) اپنی ہی بات پر ہٹ کی جس کا نتیجہ آخری وہی ہوا جو فرشتوں نے کہا۔

۳۔ خدا نے فرشتوں سے (معاذ اللہ) دھوکہ کیا کہ ان کے مقابل آدم کو سب نام بتلا دیئے اور مقابلہ کرایا۔ اگر یہی نام فرشتوں کو بتلا دیتا تو وہ بھی بتلا سکتے تھے۔ آدم کی اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کون سی بزرگی ہے۔

جواب :

میں کہتا ہوں سب آفتوں کی جڑ یہی ہے کہ متکلم سے اس کے کلام کے معنی دریافت کرنے سے پہلے ہی اس پر رائے زنی کی جائے اور آپ ہی آپ اس کی شرح کر کے حاشیہ چڑھا دیا جائے۔

اس آیت کے معنی جن کی طرف ہم نے تفسیر میں اشارہ کیا ہے سمجھنے ہی سے سب اعتراضات اٹھ جاتے ہیں جو دراصل اپنے ہی دل کے غبارات ہیں۔ پہلے یہی غلط کہ خدا نے مشورہ کیا۔ مشورہ نہیں کیا تھا بلکہ اس امر کے متعلق ان فرشتوں کو ایک حکم سنایا تھا۔ اس کے اعلان کرنے کو یہ اظہار کیا۔ چنانچہ اسی قصہ کو دوسرے مقام پر یوں بیان کیا ہے" انی خالق بشرا من طین فاذاسویته و نفخت فیه من روحی فقعوا له ساجدین" یہ مشہور ہے کہ "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں" پس اس قاعدہ کلیہ سے اس آیت نے اس آیت کی پوری تفسیر کر دی ہے کہ فرشتوں پر اس امر کا ظاہر کرنا اس غرض سے تھا کہ ایک حکیم کی ان کو اطلاع ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں " انی جاعل فی الارض خلیفة" کہہ کر " ماتقولون فی هذا الامر" نہیں کہا جو مشورہ کا دستور ہے جیسا کہ بلقیس بیگم نے (جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے) اپنا خیال ظاہر کر کے " ماذا تامرون" کہا تھا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ :

رموز مملکت خویش خرواں دانند

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

یہی وجہ ہے کہ فرشتوں نے اس امر کو تسلیم کیا اور " انك انت العلیم الحکیم" کہہ کر قصور فہم کا اعتراف کر لیا۔

تیسرے سوال کا جواب بھی میں نے تفسیر میں ادا کر دیا ہے یعنی یہ کہ فرشتوں نے علاوہ اپنی پاکی اور بزرگی جتلانے کے دعویٰ ہمہ دانی بھی کیا تھا یعنی " نسبح بحمدك

و نقدس لك" کے علاوہ "و نعلم الاشیاء کلھا" بھی کہا تھا۔ اس لیے کہ بزرگی اور زھد تو خلاف کو مستلزم نہیں جب تک کہ عملی ثبوت نہ ہو۔ قرینہ اس حذف کا یہ ہے کہ فرشتوں کے دعوی تقدیس اور زہد پر جناب باری کی طرف سے "انبئونی باسماء ھو لاء ان کنتم صادقین" ارشاد ہوا۔اگر فرشتوں کی طرف سے دعوی علم نہ ہوتا تو یہ بالکل اس کے مشابہ ہوتا ہے جو کسی مولوی صاحب نے کسی دہقانی کو سمجھایا کہ تہ بند ٹخنوں سے اونچا رکھ۔ وہ بولا تیرے باپ نے دعوت کی تھی تو نمک زیادہ نہیں ڈال دیا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا اس قصہ کا میرے وعظ سے کیا تعلق ۔ دہقانی بولا تعلق ہو نہ ہو بات سے بات نکل آتی ہے سو اگر فرشتوں نے دعوی علم نہ کیا ہوتا تو جائے "لا علم لنا" کہنے کے یہ کہتے کہ صاحب اس سوال کا یہاں کیا علاقہ! ہمارا دعوی زہد ہے اور سوال ہم سے علم کا چہ خوش! پس یہ ارشاد "انبئونی" اور "ان کنتم صادقین" جب ہی درست اور مناسب ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے کوئی دعویٰ علمیت بھی کیا ہو جس کے جواب میں ان کی غلط فہمی رفع کرنے کو یہ ضروری ہوا کہ حضرت آدم کو سب نام سکھائے جائیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ بہت سے امور ایسے بھی ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے جب ہی تو اس الزام کے بعد "سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا" پکار اٹھے اور اپنے نقصان علم کے مقر ہوئے۔ اب بتلاویں مدعی ست گواہ چست والا معاملہ ہے یا نہیں اور فہم قرآن سے بے نصیبی کے آثار ہیں یا کچھ اور۔ رہا شیطانی جھگڑا تو سو اس کا جواب ہم "ختم الله" کے حاشیہ میں دے آئے ہیں۔(19)

۴۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۴" واذقلنا للملائکة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس ابی وستکبر و کان من الکافرین" کی تفسیر میں رقمطراز ہیں :

اس آیت کی تفسیر میں بھی ہمارے نامہربان پڑوس آریہ وغیرہ نے دانت پیسے ہیں اور طرح طرح سے بے سمجھی کے سوالات کیے ہیں اور نئی توحید کے نشہ میں معلم التوحید قرآن شریف پر اعتراض کیے ہیں کہ وہ بت پرستی اور شرک سکھاتا ہے، چنانچہ فرشتوں سے آدم کو سجدہ کروایا۔ کعبہ کو چھولیا۔ موسیٰ سے آگ کو چھولیا ۔ طرفہ یہ کہ شیطان نے بوجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

توحید کے جس کی اس کو پہلے سے تعلیم ہوئی تھی سجدہ نہیں کیا تو اس کو لعنتی گردانا وغیرہ وغیرہ۔

باقی آیات کا جواب تو اپنے موقع پر آئے گا اس وقت ہم اس آیت کے متعلق ان کی سمجھ کا پھیر بتلاتے ہیں۔ بھلا آدم کو سجدہ عبودیت کا تھا یا کچھ اور۔ اگر عبودیت کا تھا تو قرآن بے شک شرک کی تعلیم دیتا ہے اور اوّل درجہ کا مشرک ہے لیکن ایسا نہیں بلکہ ایک تعظیمی سجدہ تھا جس کو دوسرے لفظوں میں سلام تعظیم کہتے ہیں اس لیے کہ اگر یہ عبادت ہوتا تو شیطان اپنی معذوری اور جواب میں " انا خیر منه خلقتنی من نار و خلقته من طین" نہ کہتا، بلکہ صاف کہتا کہ جناب والا یہ کیا انصاف ہے کہ ہمیں ایک طرف تو شرک سے روکا جاتا ہے اور دوسری طرف اسی شرک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ تو بڑا شیطان ہے اسے تو یہ عذر ضرور ہی سوجھنا چاہیئے تھا جبکہ اس کے شاگردوں کو ایسی سوجھتی ہے کہ پناہ خدا۔ تو پھر استاد کو ایسی کیوں نہ سوجھی بلکہ اس نے تو ایک معنی سے خود ہی یہ سجدہ جائز سمجھا کیونکہ وہ اپنے نہ کرنے کی وجہ بتلا رہا ہے کہ میں اس سے اچھا ہوں اس لیے اسے سجدہ نہ کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آدم کو جو اس کے خیال میں اس سے ادنیٰ تھا اس کو سجدہ کرنے کا حکم ہوتا تو شیطان کو اپنے لیے سجدہ کروانے میں کسی طرح کا تامل نہ ہوتا اور نہ تعلیم توحید اس سے مانع ہوتی۔ پس ان دونوں بیتوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ یہ سجدہ سجدہ عبادت نہ تھا بلکہ محض ان معنوں میں تھا جیسے کسی سردار یا نواب کو ماتحت ایک خاص وقت میں حاضر ہو کر سلام کیا کرتے ہیں جس سے اس سردار کی رفعت اور ماتحتوں کی وفاداری کا ثبوت ہوتا ہے جو شیطان کو پسند نہ تھا۔(۲۰)

۵۔ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۴۴ " قد نری تقلب وجهك فی السماء فلنولینك قبلة ترضاها فول وجهك شطر المسجد الحرام و حیث ما کنتم فولوا وجوهکم شطره" کی تفسیر میں بعنوان " آریہ اور عیسائیوں کی غلطی" رقمطراز ہیں:

" اس آیت سے متعلق بھی نافہم مخالفوں نے کئی طرح دانت پیسے ہیں، سب سے بڑا اعتراض تو یہ ہے کہ اسلام نے بت پرستی کو رواج دیا جو سچے مذہب کے شایان نہیں

رواج کس طرح دیا؟ اس طرح کہ جو کعبہ پتھروں کا بنا ہوا مثل ایک بت کے ہے اس کی عبادت کا حکم کیا۔ اور ایسا کیا کہ بغیر اس کی طرف رخ کیے نماز قبول ہی نہیں ہوتی۔ دوسرا اعتراض نسخ احکام کے متعلق ہے کہ پہلے حکم کو اٹھانا اس کے ناتجربہ اور لاعلمی پر مبنی ہوتا ہے اس لیے جائز نہیں کہ احکام خداوندی میں سے کوئی حکم کسی زمانہ میں صادر ہوکر پھر اٹھا دیا جائے جیسا کہ یہاں پر پہلے کعبہ سے دوسرے کعبہ کی طرف منہ پھیرنے کا حکم ہوا حالانکہ خدا تو علام الغیوب ہے۔ یہ خلاصہ ہے ان دفتروں کا جو ہمارے قدیمی مہربانی عیسائی اور آریہ وغیرہ نے بھرے ہیں۔

پہلے سوال کا جواب دو طرح سے اجمالی اور تفصیلی۔ اجمالی تو دو ٹوک بات ہے کہ شرک اور بت پرستی اسے کہتے ہیں کہ غیر خدا کی عبادت کی جاوے یا کم سے کم اس سے وہ معاملے کیے جائیں جو خدا کے ساتھ ہونے چاہئیں مثلاً امید بھلائی یا دفع ضرر۔ مگر چونکہ کعبہ کی نسبت اسلام نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا بلکہ صاف اور صریح لفظوں میں "فلیعبدوا رب ھذا البیت" فرمایا، کعبہ کے خدا کی عبادت کرو۔ تو رب اسلام کی نسبت یہ گمان کرنا کہ کعبہ پرستی اور بت پرستی سکھاتا ہے سراسر انصاف کا خون کرنا ہے۔

تفصیلی جواب سے پہلے مسلمانوں کی نماز کا مطلب بیان کرنا کسی قدر مفید ہوگا تاکہ ثابت ہو جائے کہ اسلامی نماز جس پر تمام اہل اسلام فخر کیا کرتے ہیں کہاں تک توحید یا شرک سے بھری ہوئی ہے۔ کیا اس میں کوئی کلمہ بھی ایسا ہے جس میں کعبہ کی مدح یا تعظیم ہو، پھر اس نماز کو بھی ہمارے نافہم مخالف شرک اور بت پرستی کہیں گے تو اس کے جواب میں ہم سے یہی سنیں گے۔

پس تنگ نہ کرنا صبح نادان مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

بعد اس کے ہم اپنے مخالفین سے پوچھتے ہیں کہ اگر اسلام کو کعبہ پرستی منظور ہوتی اور شرک اور بت پرستی کا رواج مد نظر ہوتا تو کیا وجہ ہے کہ ساری نماز میں کعبہ کا ذکر تک نہیں، نہ اس سے خطاب ہے، نہ اس سے استمداد، نہ اس کا ذکر، نہ اس کا نام، پھر کعبہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پرستی ہے تو کہاں ہے؟ میں نہیں جانتا کوئی منصف مزاج اس معروضہ تقریر پر غور کر کے اسلام پر کعبہ پرستی کا الزام لگائیں۔

رہا سوال کہ نماز میں تو بے شک شرک کی بو تک نہیں مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم آیا ہے انسان کو اس امر میں مختار کیوں نہیں کیا گیا کہ جس طرف منہ کر کے چاہتا اپنے مالک کی عبادت کر لیتا سو اس کا جواب بعد تمہید کے یہ ہے۔

ہمیشہ قاعدہ ہے کہ ایک امر مقصود اصلی کے ساتھ کوئی مقصود تبعی بھی ہوا کرتا ہے مثلاً علم کا پڑھنا مقصود اصلی ہے تو حروف کا سیکھنا غیر اصلی لازم ہے گو بعد حصول علم حروف ابجد کا خیال تک نہیں رہتا۔ اسی طرح دفع دشمن کے لیے تلوار یا بندوق کا امکان لازم ہو جاتا ہے حالانکہ اس کے اٹھانے سے سوائے تحمل بوجھ کوئی فائدہ نہیں مگر بایں لحاظ کہ یہ بوجھ ایک ضروری کام دفع دشمن کا ذریعہ ہے، عمدہ اور احسن ہو جاتا ہے۔ اس تقریر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو امر کسی دوسرے امر کا ذریعہ ہوا کرتا ہے اس کا حسن و قبح اصل ذریعہ کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یہی تلوار کا اٹھانا جو بلحاظ اس امر کے کہ یہ تلوار دفع دشمن کے لیے ایک ذریعہ ہے اور احسن اور عمدہ ہے اگر کسی بیکس مظلوم پر چلائی جائے تو قبیح ہوتا ہے ہاں اس امر کی پہچان بعض دفعہ مشکل ہو جاتی ہے کہ مقصود اصل کیا ہے اور مقصود تبعی کیا ہے سو اس کے لیے عام قاعدہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے جو امر ایسا ہو کہ اس کے حصول کے بعد دوسرے کے لیے تردد کرنا باقی رہے اور مقصود سے فارغ البالی نہ ہو تو وہ مقصود اصلی نہیں اور جس کے حصول کے بعد دوسرے کی تلاش نہ رہے تو وہ امر مقصود اصلی ہوگا۔ مثلاً دوا کا بنانا اور گھوٹنا ایک ایسا امر ہے کہ اس کے حصول پر قناعت نہیں کی جا سکتی جب تک بیمار کو شفا نہ ہو جائے۔ ہاں اگر بغیر دوانوشی کے مرض سے عافیت ہو جائے تو دوا کا مطلق خیال بھی نہیں ہوتا ہماری اس تقریر سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مقصود اصلی کس حال میں متروک اور مفروغ عنہ نہیں ہو سکتا۔

پس اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تعین جہت کو اسلام نے کوئی مقصود اصلی قرار دیا ہے یا تبعی۔ بعض مواقع پر اس کا حکم ساقط ہو جانا صاف دلیل ہے کہ یہ کوئی امر اصلی نہیں مثلاً جنگ کی حالت میں بشدت خوف جدھر رخ ہو نماز پڑھے جانا خواہ کعبہ کی طرف پیٹھ بھی ہو، اس امر کو ثابت کر رہا ہے کہ کعبہ کی طرف توجہ کرنا مقصود اصلی نہیں بلکہ صرف اس امر کے لیے ہے کہ مسلمانوں میں جیسا کہ معنوی اتحاد ہے صوری موافقت بھی حاصل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے جو اختیار دینے کی صورت میں متصور نہ تھا۔ کیونکہ جب ہر ایک کو اختیار ملتا اور اس بات کا مجاز ہوتا کہ دوسرے کے منہ کی طرف منہ کرے یا پیٹھ ایک مشرق کو رخ کرے تو دوسرا مغرب کو، تیسرا جنوب کو تو چوتھا شمال کو تو یہ فائدہ جو یکجہتی سے حاصل ہے نہ ہوتا۔ پس یہی وجہ اس کے مقصود تبعی ہونے کی ہے۔ یہ تقریر اس وقت بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے جب نماز کے معانی اور مطالب ذہن نشین کر کے یہ دیکھا جائے کہ اس میں تو کسی جہت یا کعبہ کا نام تک نہیں پس اگر یہ مقصود اصلی ہوتا تو اصلی عبادت کے طریق اور اس کے الفاظ میں اس کا ذکر ہوتا کیونکہ بغیر مقصود کسی کام کا کرنا کون نہیں جانتا کہ علاوہ لغو ہونے کے تضییع اوقات اور بے ہودہ پن بھی ہے۔ پس ہماری ہمسایہ قوم آریہ اور عیسائی وغیرہ اسلام کے مخالف ہماری تقریر پر غور کریں اور نتیجہ سے ہمیں اطلاع دیں۔ اگر کچھ شبہ ہو تو تمام قرآن میں تلاش کر کے کوئی آیت اس مضمون کی نکالیں جس سے ثابت ہو کہ نماز میں کعبہ کی پرستش ہے۔ نہ ملنے پر ہم آپ سے صرف ایک چیز چاہتے ہیں جو نہایت آسان ہے مگر کسی مخالف کے حق میں مشکل اور گراں سے گراں ہے وہ وہی ہے جس کا پیارا نام "انصاف" ہے جو انسان کو ہر جگہ عزت دلاتا ہے اور اعزاز سے یاد کراتا ہے۔

رہا اعتراض نسخ احکام کے متعلق تو اس کا جواب یہ ہے کہ نسخ میں حکم سابق کا اٹھا دینا دو طرح پر ہے۔ ایک تو جس طرح حکام زمانہ کوئی قانون بتدریج بدلتے ہیں۔ پہلی ترتیب کے وقت ان کو علم نہیں ہوتا کہ اس میں کیا خرابی ہوگی جس کے سبب سے اس میں کچھ تغیر آئے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری قسم طبیب کی تبدیلی نسخہ جات کی طرح ہے کہ رفتہ رفتہ بتدریج طبیعت کو درستی پر لاتا ہے۔ منفج دے کر مسہل تجویز کرتا ہے۔ ان دو قسموں میں اول تو بے شک حاکم کی لاعلمی پر دلالت کرتا ہے مگر قسم دوم بجائے لاعلمی کے کمال علمی بتاتا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اہل اسلام کون سے نسخ کے قائل ہیں۔ قسم اوّل کے، حاشا وکلا ہرگز نہیں، البتہ قسم دوم کے جمہور اہل اسلام معترف ہیں اور اس سے نہ تو اللہ کے علم میں کوئی نقصان آتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اعتراض ہے"۔ (۲۱)

ان مختلف آیات کی تفسیر یہ ظاہر کرتی ہے کہ مولانا کا بحیثیت مناظر ہندوستان کے مخالف اسلام مذاہب کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور وہ متکلمانہ انداز میں ان کے ہر اعتراض کا رد کرتے ہیں۔

پھر قرآن چونکہ ایسی کتاب ہے جس کی تلاوت اور فہم و تدبر ہر مسلمان کی خواہش ہے اور یہ اسلام کا دستور ہے۔ اس لیے مولانا نے اس کی تفسیر کرتے وقت آریہ، عیسائیوں، قادیانیوں، نیچریوں، اور ملحدوں سمیت تمام مخالف اسلام معترضین کے اعتراضات کا جواب دے کر نہ صرف کہ مسلمانوں کے وکیل کی حیثیت سے اسلام کا دفاع کیا ہے بلکہ ان کا زبردست رد کر کے آئندہ آنے والی مسلمان نسلوں کو ان کے غلط اثرات سے ہی محفوظ کر دیا ہے۔ رب العالمین سے دعا ہے کہ وہ اپنی کتاب کی خدمت میں مولانا کی یہ مساعی قبول فرمائے۔ آمین۔

حواشی اور حوالہ جات

۱۔ ترمذی۔ محمد بن عیسی ابو عیسی۔ کتاب فضائل القرآن۔ باب ما جاء فی القرآن(قاہرہ۔ مطبعة مصطفیٰ الحلبی۔ لطبعة لثانیہ ۱۹۷۵ء)۵/۱۷۲

۲۔ امرتسری۔ ثناء اللہ ابوالوفا۔ قرآن مجید مع تفسیر ثنائی(لاہور۔ ثنائی اکیڈمی) ص ۸۳۴

۳۔ ایضاً

۴۔ امرتسری۔ ثناء اللہ ابوفا۔ تفسیر ثنائی۔ (لاہور۔ ادارہ ترجمان السنۃ) ص ۵

۵۔ فضل الرحمٰن بن میاں محمد۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری (لاہور دارالدعوۃ السلفیہ) ص ۳۶

۶۔ قرآن مجید مع تفسیر ثنائی ص ۸۳۵

۷۔ ایضاً

۸۔ سوہدروی۔ عبدالمجید خادم۔ سیرت ثنائی (لاہور۔ مکتبہ قدوسیہ) ص ۱۱۰

۹۔ سابق مصدر ص ۶، ۷

۱۰۔ تفسیر ثنائی ص ۷

۱۱۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری ص ۱۲۳

۱۲۔ قرآن پاک کی تفسیریں چودہ سو برس میں (پٹنہ۔ خدابخش لائبریری۔ طبع ۱۹۸۹م) ص ۳۰۴

۱۳۔ سابق مصدر ص ۳۱۴

۱۴۔ سابق مصدر ص ۳۱۵

۱۵۔ سیرت ثنائی ص ۲۴۷

۱۶۔ تفسیر ثنائی ص ۹، ۱۰

۱۷۔ سابق مصدر ص ۳۰۔۳۲

۱۸۔ سابق مصدر ص ۳۳، ۳۴

۱۹۔ سابق مصدر ص ۵۴۔۵۶

۲۰۔ سابق مصدر ص ۵۷

۲۱۔ سابق مصدر ص ۱۰۸۔۱۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com